بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اداریہ

کرنے کے دو کام

بلال عبدالحی حسنی ندوی

غیر منقسم ہندوستان میں مسلمان ایک طاقت تھے، ملک کی آزادی میں انھوں نے قائدانہ کردار ادا کیا تھا، کتنے ہندو قائدین کو مسلمانوں نے اسٹیج پر پہنچایا اور وہ ملک میں قائد و رہنما کی حیثیت سے متعارف ہوئے، ان قائدین کو اس کا پورا احساس تھا، ساتھ ہی ساتھ ان کے اندر یہ خیال بھی پکنے لگا تھا کہ اگر مسلمان اسی طاقت کے ساتھ رہ گئے تو غیر مسلم اکثریت کی محکومانہ ذہنیت کو ختم نہیں کیا جاسکے گا، حالانکہ یہ خیال زیادہ مبنی بر حقیقت نہ تھا، مسلمانوں نے ہندوستان میں ہمیشہ ہندوؤں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کیا، ہندوستان میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ تاریخ اس سے بھری پڑی ہے، لیکن اس کے باوجود ان کے اُس خیال نے غیر مسلم قائدین کو خاص طور اس پر آمادہ کیا کہ وہ مسلمانوں کو خانوں میں بانٹ دیں، خواہ اس کے لیے انھیں ملک کو بانٹنا پڑے، ملک کی تقسیم کا اصل پس منظر یہی ہے۔ مسلمانوں نے اسلامی ریاست کے عنوان سے ملک کے ایک مختصر سے حصہ کو لینا ہی کافی سمجھا، اس کے بعد سے ہندوستان میں مسلمان نمبر دو کے شہری قرار دے دیے گئے اور ان کی ساری توانائیاں اپنے حقوق کے مطالبات پر صرف ہونے لگیں، ان کو بہت کم اس کے مواقع مل سکے کہ وہ مثبت طریقہ پر تعمیری کام کرسکیں۔

احتجاجات، دھرنوں اور مطالبات کا جو سلسلہ چلا، اس نے مسلمانوں کی ذہنیت پر ایک سوالیہ نشان کھڑا کردیا، مسلمانوں کا اصل مقام لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا، اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر الیکشن کے موقع پر مختلف سیاسی پارٹیاں مسلمانوں کو لبھانے میں مصروف نظر آتی ہیں، ہر وہ پارٹی جس کو سیکولر ہونے کا دعوی ہے کوشش کرتی ہے کہ اپنے انتخابی منشور میں مسلمانوں کے لیے وعدوں کی بھر مار کردے لیکن اب تک کیا ہوتا چلا آیا ہے، ''سچر کمیٹی'' کی رپورٹ سے وہ پوری طرح سامنے آچکا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان کے آئین نے اقلیتوں کو بہت کچھ حقوق دیے ہیں، لیکن اس کے لیے خود مسلمانوں کو بہت کچھ کرنا پڑے گا، نہ محض توقعات سے کام چلے گا اور نہ صرف مظاہروں سے۔

اس وقت دو کام بہت اہم اور بنیادی ہیں، اگر مسلمان دانشور کچھ عرصہ کے لیے ٹھوس طریقہ پر اس میں لگ جائیں تو چند سالوں میں بڑی تبدیلی کی توقع کی جاسکتی ہے، ایک کام خود مسلمانوں میں کرنے کا ہے اور دوسرا پورے ملک سے متعلق ہے، اور یہ بھی مسلمانوں ہی کی ذمہ داری ہے۔

پہلا کام تو تعلیم (Education) سے متعلق ہے، اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ جگہ جگہ مسلمان اپنے تعلیمی ادارے قائم کریں، اعلی معیار کے ایسے اسکول کھولیں جہاں مسلمان نسل صحیح ذہن کے ساتھ تیار ہوسکے، اس میں شبہ نہیں کہ یہ کام کسی نہ کسی درجہ شروع ہوچلا ہے لیکن چونکہ اس میں خاصی تاخیر ہوچکی ہے اس لیے وسیع پیمانے پر اس کی ضرورت ہے، ایک ایک شہر میں مسلم آبادی کے تناسب سے اسکول ہونے چاہئیں اور ان میں نئی نسل کے ذہنوں کی صحیح آبیاری کی ضرورت ہے، اسی طرح یہ کام بھی بہت اہم ہے کہ ہر بڑے شہر میں ایسے مراکز (Centres) ہوں جہاں مسلمان بچوں کو اعلی تعلیم کے لیے تیار کیا جائے، خاص طور پر سول سروسز (Civil Services) کے امتحانات کے لیے ان کو تیار کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی ایسی ذہن سازی ہو کہ ان میں کسی درجہ دین کی فکر اور ملت کا درد پیدا ہوجائے، اگر وسیع پیمانہ پر یہ کام شروع ہوجاتا ہے تو یقیناً چند سالوں میں اس کے بہتر نتائج کی امید ہے۔

دوسرا کام جو ہر کام کے لیے معاون کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے مسلمانوں کی افادیت سامنے آتی ہے اور یہ مسلمانوں ہی کی بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ پورے ملک میں ہر جگہ اخلاق و کردار کا وہ نمونہ پیش کریں جو دوسروں کو اپیل کرتا ہو، برادران وطن کے سامنے وہ حقائق رکھے جائیں کہ ان کی آنکھیں کھل جائیں، ''پیام انسانیت'' کے عنوان سے یہ کام ہر جگہ کیا جاسکتا ہے، اور جہاں جہاں یہ کام ہوا ہے اس کے بہتر نتائج سامنے آرہے ہیں، مسلمانوں کو اللہ نے جو اخلاقی تعلیمات دی ہیں اور ان کے پاس جو نظام زندگی ہے پوری دنیا اس کی پیاسی ہے، اور مسلمانوں کا اصل کام یہی ہے کہ وہ یہ سوغات ساری دنیا میں تقسیم کریں، اس ملک کو اس کی بہت ضرورت ہے لیکن افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں نے اپنا منصب کھودیا، ان کو دینے کے لیے پیدا کیا گیا تھا لیکن وہ ہر جگہ دست سوال پھیلائے نظر آتے ہیں! مسلمانوں نے اس ملک کو بہت کچھ دیا ہے اور وہ بہت کچھ دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، بس ضرورت اس بات کی ہے کہ اس ذمہ داری کا احساس ان کو پیدا ہوجائے۔

یہ کرنے کے دو کام ہیں، اور یہ دو مضبوط بنیادیں ہیں اگر ان کو مسلمانوں نے تعمیر کرلیا تو آگے بڑی سے بڑی عمارت تعمیر کرنا ان کے لیے کچھ مشکل نہیں۔

ماہنامہ
پیام عرفات
رائے بریلی

الإمام أبي الحسن الندوي • مرکز

جلد نمبر ۱ — شمارہ نمبر ۵

مئی ۲۰۰۹ء / جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ

سرپرست
حضرت مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ
(صدر، دارِ عرفات)

نگراں
مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی مدظلہ
(جنرل سکریٹری، دارِ عرفات)
مولانا احمد علی حسنی ندوی مدظلہ
(ڈائریکٹر، دارِ عرفات)

مجلس ادارت
بلال عبدالحی حسنی ندوی
مفتی راشد حسین ندوی
عبدالسبحان ناخدا ندوی
محمود حسن حسنی ندوی
محمد حسن ندوی

معاون ادارت
محمد نفیس خاں ندوی

فی شمارہ: ۷ روپئے — سالانہ: ۷۰ روپئے
اعزازی (سالانہ) ۵۰۰ روپئے

مرکز الامام أبی الحسن الندوي
دار عرفات، تکیہ کلاں
رائے بریلی (یوپی) ۲۲۹۰۰۱
E-Mail: alnadwi@yahoo.com

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر ''پیام عرفات''، مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارِ عرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

تنگ نظری کا مرتکب کون؟

مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی

اس دور کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ وہ مذہب جو حق کا علمبردار اور مساوات وانسانی بلندی کا قائل ہے اسے دہشت پسند اور تشدد پسند مذہب کے نام سے موسوم کیا جارہا ہے، اور وہ امت جس نے دنیا کو ہر طرح کی غلامی سے آزادی دلائی اور اسے تہذیب، اتحاد اور حریت عطا کی اسے پسماندہ، بیک ورڈ اور سنگدل امت ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

اہل قلم دنیا کو اس بات پر مطمئن کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ مسلم معاشرہ جس بدحالی سے دوچار ہے اور اس میں جو المیے، حادثے، ظلم وزیادتی اور قتل و غارت گری کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ اس نے اسلام کو مضبوطی سے تھام رکھا ہے اور اسلامی تعلیمات کی پیروی کرتا ہے۔

مزید برآں مسلم تشخص پر حرف زنی کی جاتی ہے اور مسلم حکمرانوں اور ان کی سرگرمیوں کو بنظر احتقار دیکھا جاتا ہے، اور اس سلسلہ میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا کہ ان کے یہ اعمال اور ان کی سرگرمیاں مغرب کی تقلید ونقالی میں ظاہر ہورہی ہیں یا مغربی حکمرانوں کی طرف سے پیدا شدہ حالات کے نتیجہ میں رونما ہورہی ہیں، اس کے برعکس جو بھی برائیاں ہوتی ہیں ان کا سررشتہ دین ومذہب اور قرآن سے جوڑ دیا جاتا ہے۔

مسلمانوں کے لیے یہ سب سے بڑا مسئلہ ہے کہ انہیں ایسی باتیں سننی اور دیکھنی پڑتی ہیں جو ان کے احساسات کو بے روح اور ان کی تاریخ کو مسخ کرتی ہیں، سب سے زیادہ تکلیف دہ بات تو یہ ہے کہ اس قسم کی افترا پردازیاں اور الزام تراشیاں مسلم حکومتوں کے ہونے کے باوجود پیش آتی ہیں، یہ ساری چیزیں مسلم رہنماؤں کے سامنے رونما ہوتی رہتی ہیں، لیکن کسی کو ان کی تردید اور تکذیب کی جرأت نہیں ہوتی، اور جو لوگ تردید کی کوشش کرتے بھی ہیں تو ان کے قلم میں زور نہیں ہوتا۔

مسلمان اس صورت حال سے مسلسل دوچار ہیں، اور اس کی ذمہ داری ان مغربی نظامہائے حکومت پر عائد ہوتی ہے، جو بعض مسلم ممالک میں رائج ہیں، ان میں سے بیشتر ملکوں میں تشدد کے بہت سے واقعات صرف اس لیے پیش آئے کہ ان حق پرستوں کی آواز دبا دی جائے جو اسلام کو اپنانا چاہتے ہیں اور گمراہی اور انسان کشی کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ مسلم ملکوں میں اسلام کی مخالفت کرنے والے کسی شخص پر کوئی پابندی نہیں ہے، جب کہ ایسے ہزاروں افراد مختلف زیادتیوں اور متنوع عتاب کا شکار ہیں، صرف اس لیے کہ وہ اسلام کی سربلندی چاہتے ہیں۔

دنیا کے سارے مذاہب آزادی سے ہم کنار ہیں لیکن مسلمانوں کے ساتھ جبر واکراہ اور ظلم وزیادتی کی پالیسی اپنائی جارہی ہے صرف اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں، ان کی عزت وآبرو پر حملے کیے جارہے ہیں، اور ان کی اولاد کو ایسے نظریات وافکار سیکھنے پر مجبور کیا جارہا ہے، جو ان کے عقیدہ وتاریخ سے متصادم ہیں۔ بعض ملکوں میں مسلمان مظلوم قوم کی حیثیت سے ہیں، انھیں نہ آزادئ عبادت اور حریت عمل حاصل ہے اور نہ عام زندگی میں شرکت کی آزادی، ان کی زندگی انتہائی قید وبند کی زندگی ہے، انہیں اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جارہا ہے، بعض ملکوں میں اپنی مرضی کے مطابق نام رکھنے، مردوں کو دفن کرنے اور بچوں کو تعلیم دینے پر بھی پابندی ہے۔ کچھ مسلمان قومیں اپنے ہی ملک میں غیر مسلم حکومتوں کے تابع ہیں جو ناخوشگوار حالات پیدا کرنے کی کوشش کررہی ہیں اور جہاں پیشہ ور اہل قلم آزادی سے اسلامی عقائد کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاتی۔

کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ بیشتر مسلم ممالک میں دینی کتب ضبط کرلی جاتی ہیں اور ایرپورٹ، بندرگاہوں اور سرحدوں تک پہنچتے ہی بلاتحقیق روک لی جاتی ہیں، اور فحش لٹریچرز اور اسلام مخالف کتابوں کو پوری آزادی حاصل ہے بلکہ انہیں خوش آمدید کہا جاتا ہے۔

کیا یہ بڑی ناانصافی اور زیادتی کی بات نہیں ہے کہ تعمیری اور سماجی روح بیدار کرنے والی ادبی اور ثقافتی تنظیموں پر اسلامی ممالک میں پابندی عائد ہے لیکن ایسی تباہ کن تحریکوں اور تخریب کار تنظیموں کو مکمل آزادی حاصل ہے جو فساد اور انارکی پھیلاتی ہیں اور نوجوانوں کے اخلاق بگاڑتی ہیں۔

کیا یہ ناانصافی کی بات نہیں ہے کہ ان ممالک میں عیسائیت کی تبلیغ واشاعت، کلیساؤں کی تعمیر، اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ان کی تشہیر کی پوری آزادی ہے اور رفاہی اداروں اور عام ضرورت کی چیزوں کو اس مقصد کے لیے ناجائز طور پر استعمال کیا جارہا ہے، عیسائیوں کو اپنے میڈیائی سینٹرز اور ریڈیو اسٹیشن قائم کرنے کے حقوق حاصل ہیں، اس کے برعکس مسلم داعیوں کو اسلام کے لیے کوئی تحریک یا تنظیم قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے بلکہ ان میں سے اکثر کی سرگرمیوں پر پابندی ہے۔

مسلم اکثریت اپنے ہی ملک میں غیر مسلم اقلیت کی محکوم ہے اور اس کی پشت پناہی مغربی حکومتیں کررہی ہیں، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ افغانستان میں تیس لاکھ سے زیادہ مسلمان اپنی آزادی کے حصول میں اپنے آپ کو قربان کر بیٹھے اور چالیس لاکھ سے زائد جلا وطن کردیے گئے۔ الجزائر میں دس لاکھ سے زیادہ مسلمان اپنی آزادی کی راہ میں قربان کردیے گئے، سوڈان اور صومالیہ کو صلیبی حملوں کا سامنا ہے، انڈونیشیا کو مکمل عیسائی ملک بنادینے کا دعوی ہے۔ فلپائن میں مسلمانوں پر ظلم وزیادتی کا سلسلہ جاری ہے، اسرائیل نے مسلمانوں کی زمین پر غاصبانہ قبضہ کررکھا ہے اور مغرب کے تعاون سے امن وسکون کی زندگی گزار رہا ہے، اس کے ایجنٹوں نے صابرہ اور شتیلا اور پھر غزہ میں جو قتل عام کیا اور اسلامی مقدس مقامات کو جس بے دردی سے تباہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں اس سے یکسر چشم پوشی کی جاتی ہے بلکہ بسا اوقات ان کی حمایت بھی کی جاتی ہے۔

مزید برآں مختلف ممالک میں مسلمانوں کو نیست ونابود کرنے اور جلا وطن کرنے کی کوششیں جاری ہیں، جو تہذیب جدید، حریت اور امن کے دعویدار ہیں، اور اپنے کو سیکولر کہتے ہیں، ان کی عبادت گاہیں اور قبرستان خطرے میں ہیں، ان کے تعلیمی اداروں پر طرح طرح کی پابندیاں ہیں، اس کے باوجود دور جدید کی بس ایک ہی آواز ہے جو درحقیقت مغرب کی آواز ہے ''مسلمان دہشت پسند ہیں، ان کا مذہب دہشت پسندی کا حکم دیتا ہے''، اگرچہ یہ تاریخ کے خلاف ہے لیکن چونکہ مغرب کی آواز ہے اس لیے حق ہے، عربی شاعر نے کہا تھا۔

اذا قالت حذام فصدقوها فإن القول ما قالت حذام

اس کا تھوڑے تصرف کے ساتھ ترجمہ کیا جائے تو یہ کہ مغرب میں جو بات کہی جائے اس کی تصدیق کرو، بات وہی ہے جو مغرب کہے۔

سچا راستہ

بلال عبدالحی حسنی ندوی

یہ دنیا بھول بھلیاں کی طرح ہے، جو اس میں بھٹک گیا وہ مصیبت میں پڑ گیا، اس کو اگر صحیح راستہ نہ مل سکا تو ہلاکت ہی اس کا مقدر ہے، موجودہ دنیا میں سیکڑوں راستے لوگوں نے بنا رکھے ہیں، عام طور پر لوگ آنکھ بند کر کے ان ہی خطوط (Lines) پر چلتے رہتے ہیں جو ان کے باپ دادا سے چلی آتی ہیں، کم لوگ اس کا جائزہ لیتے ہیں کہ یہ راستہ منزل مقصود تک پہنچتا ہے یا نہیں، یہ کہانی آج کی نہیں ہے، ہزاروں سال سے دنیا اسی نظام پر چل رہی ہے، ایک آدمی جب قافلہ سے بچھڑتا ہے تو وہ اپنے لیے نیا راستہ بنالیتا ہے، وہ یہ نہیں جانتا کہ یہ راستہ کدھر جارہا ہے اور وہ کہاں اس کو پہنچا کر ہلاکت کے گھاٹ اتارے گا، اس کی دیکھا دیکھی بہت سے لوگ اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں اور اس غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں کہ جب راستہ پر لوگ رواں دواں ہیں تو یہ ضرور صحیح منزل تک پہنچادے گا، وہ ہلاکت سے بے خبر رہتے ہیں، اسی لیے لوگوں میں یہ خیال بھی پیدا ہوگیا ہے کہ راستے مختلف سہی منزل سب کی ایک ہے، یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے جس کے نتیجہ میں بہت سے لوگ سچ سے محروم ہیں اور وہ غور کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے۔

اتنی وسیع اور بھری پری دنیا میں انسان زندگی گزارتا چلا آرہا ہے، اربوں آئے اور چلے گئے اور کتنے آئیں گے اس کا کچھ پتہ نہیں، کیا یہ سب یوں ہی ہورہا ہے؟ اتنا بڑا نظام بغیر کسی مقصد کے چل رہا ہے، خود بخود سب ہوتا چلا جارہا ہے یا اس کے پیچھے کسی طاقت والے حکمت والے کا ہاتھ ہے؟ کوئی بھی ہوش رکھنے والا بے ساختہ بول اٹھے گا: "ذٰلک تقدیر العزیز العلیم" (یہ تو زبردست، جاننے والے کا نظام قدرت ہے)، وہ طاقت والا کون ہے جس کے ہاتھ میں کل کائنات کا نظام ہے، اسی کے کرنے سے سب کچھ چل رہا ہے، ماں کے پیٹ میں وہی بچہ کی تربیت کرتا ہے، بڑے بڑے درختوں کی لاکھوں پتیوں کو وہی غذا پہنچاتا ہے اور ان کو تر و تازہ رکھتا ہے۔ نظام ہائے شمسی کس کے اشارے پر قائم ہیں، یہ وہی خدائے بزرگ و برتر ہے، جس نے تمام انسانوں کے مورث اعلیٰ حضرت آدم کو پیدا کیا، ان کو حضرت حوّا کے ساتھ دنیا میں اتارا اور دنیا کو ان کی اولاد سے آباد کیا اور یہ کہہ دیا کہ ہم تم کو زندگی گزارنے کا راستہ بتاتے ہیں، تمہیں اسی راستہ پر چلنا ہے، اپنے مالک کو پہچاننا ہے۔ اس نے اعلان کردیا کہ ہم تمہارا امتحان لیں گے، دنیا میں جو اپنے خالق و مالک کو پہچان کر اس کے بتائے ہوئے اور اس کے پیغمبروں کے لائے ہوئے طریقہ پر زندگی بسر کرے گا وہ کامیاب ہوگا۔

دنیا کی بھول بھلیاں میں جب جب انسان بھٹکا اس نے اپنے پیغمبر بھیجے تاکہ وہ صحیح راستہ بتادیں اور کتابیں اتاریں تاکہ ان کی روشنی میں سفر صحیح سمت کی طرف ہو، یہ سلسلہ جاری رہا، پوری دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں انسان بستے ہوں اور وہاں اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبر نہ آئے ہوں۔

سب سے آخر میں جب دنیا کی حالت بہت بگڑ گئی، انسان نے اپنے خالق کو فراموش کردیا، اور سچ کا سرا لوگوں کے ہاتھوں سے پوری طرح چھوٹ گیا تو اللہ کو دنیا پر رحم آیا اور اس نے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد (ﷺ) کو تمام انسانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا اور اپنی آخری کتاب ان پر اتاری اور جب تک دنیا قائم ہے اس وقت تک کے لیے اس کو رہنما بنا دیا، یہی وہ سچ ہے جس کا تذکرہ تورات و انجیل میں ہے، اور اس کا تذکرہ ہر آسمانی کتاب میں کیا گیا ہے اور اب تو تحقیق سے یہ بات سامنے آچکی ہے کہ اس کا تذکرہ "ویدوں" میں بھی ہے۔

محمد رسول اللہ (ﷺ) نے دنیا کے انسانوں کو صحیح راستہ بتایا اور اپنے بلند اخلاق، سچائی، امانت داری اور انسانوں کی محبت و تڑپ سے ایک ایک انسان کے دل میں جگہ بنالی، آپ (ﷺ) سے نفرت اسی نے کی جو انسان کہلانے کا مستحق نہیں، قرآن کریم کی شکل میں اللہ نے آپ کو جو کتاب دی آپ (ﷺ) نے قول و عمل سے اس کی تفسیر فرمادی، اس طرح زندگی گزارنے کا ایک ایسا دستور العمل انسانوں کے سامنے آگیا جس سے زیادہ بہتر کا انسان تصور بھی نہیں کرسکتا تھا، اور کیوں نہ ہوتا، یہ اس مالک کی اتاری ہوئی کتاب اور دستور تھا جو انسانوں کا خالق ہے، ان کی نفسیات اس کے سامنے ہیں، ان کی ضرورت سے وہ واقف ہے اس لیے اس نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا جو انسان کر نہ سکے۔

قرآن کریم کی سب سے بڑی دعوت و پکار مالک کو پہچاننے کی پکار ہے، اللہ کو ایک جاننے اور ایک ماننے کی دعوت ہے، نہ اس کی ذات میں کوئی شریک ہے اور نہ اس کی صفات میں، پھر آخرت کی زندگی کو یاد دلایا گیا ہے، بار بار اس کو مثالوں سے سمجھایا گیا ہے کہ جس طرح موسم خزاں میں زمین خشک ہوجاتی ہے پتے جھڑ جاتے ہیں اور اس کے بعد بارش کی چھینٹ پڑتے ہی مردہ زمین میں جان پڑ جاتی ہے، سبزہ لہلہانے لگتا ہے، درخت ہرے بھرے جھومنے لگتے ہیں اسی طرح انسان مٹی میں مل جانے کے بعد اللہ کے حکم سے دوبارہ اٹھایا جائے گا اور اس سے اس کے کاموں کا سوال ہوگا، جنہوں نے سچائی کا راستہ اختیار کیا ہوگا وہ کامیاب ہوں گے اور جنہوں نے اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی پوجا ہوگا وہ اس دن رسوا کیے جائیں گے۔

محمد رسول اللہ (ﷺ) ساری زندگی اس کی دعوت دیتے رہے، ایک اللہ کی بندگی سکھاتے رہے، آخرت کی یاد دلاتے رہے، اور اللہ کا بتایا ہوا نظام چلاتے رہے، جب دنیا سے آپ (ﷺ) کے جانے کا وقت قریب ہوا تو سوا لاکھ کے مجمع میں آپ (ﷺ) نے یہ بھی اعلان فرمادیا: "وقد ترکت فیکم مالم تضلوا بعدہ إن اعتصمتم بہ، کتاب اللہ" (اور دیکھو میں اپنے بعد تمہارے لیے ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑے رکھا تو تم گمراہ نہ ہوگے، وہ چیز کیا ہے؟ وہ ہے کتاب اللہ، یعنی قرآنی دستور العمل)۔

دنیا کے سیکڑوں راستوں میں یہی تنہا قرآنی راستہ ہے جو سچائی کی طرف لے جاتا ہے، انسان کو اللہ کی معرفت سکھاتا ہے، توحید کا سبق دیتا ہے، انسانوں کو جینے کا سلیقہ بتاتا ہے اور انسانیت کا چراغ روشن کرتا ہے، تمام انسانوں کو ایک اللہ کی بندگی کی دعوت دیتا ہے، آج ضرورت ہے کہ تمام انسان اس کی تعلیمات پر غور کریں، سیرت نبوی (ﷺ) میں اس کی روشنی دیکھیں اور پھر اپنے اختیار کیے ہوئے طور طریق کا جائزہ لیں اور حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

قرآن کریم کا تصور انسان

قسط دوم

عبدالسبحان ناخدا ندوی

قرآن کریم کی رو سے اسلامی نظام زندگی سے ہٹا ہوا ہر نظام ''متاع غرور'' ہے، یعنی دھوکہ کا سامان ہے، قرآن کریم کا صاف اعلان ہے: **"وما الحياة الدنيا إلا متاع الغرور"** (دنیوی زندگی تو بس دھوکہ کا سامان ہے) اس مبارک آیت میں الحیاۃ الدنیا سے مراد اللہ کی متعین کردہ راہوں سے ہٹ کر بسر کی جانے والی ہر زندگی ہے، اس کا نتیجہ ہمیشہ دھوکہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، کچھ لوگ ٹھوکر کھا کر سنبھل جاتے ہیں، اور بہت سارے ان ہی ٹھوکروں میں اپنی متاع حیات لٹا دیتے ہیں، قرآن کریم کے نزدیک انسان کا مطلب ''انسان مسلم'' ہے، یعنی سراپا اللہ کے لیے وقف انسان، اس کا اعلان یہ ہے کہ کل کائنات میں مرکزی حیثیت تنہا اللہ رب العزت کی ہے، زمین اس کی، آسمان اس کا، سارا جہاں اس کا **"لله ما في السماوات و ما في الأرض"** (جو کچھ آسمان میں ہے وہ اللہ کا، اور جو کچھ زمین میں ہے وہ بھی اللہ کا)، وہ تمام انسانوں کے لیے زندگی کا مقصد **"الاسلام"** قرار دیتا ہے، اس کا کہنا ہے: **"إن الدين عند الله الإسلام"** (دین تو اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے)، یعنی انسان سب کچھ اللہ کے حوالہ کردے اور اس کی متعین کی ہوئی راہوں پر زندگی کا سفر جاری رکھے، اس کا کہنا یہ بھی ہے کہ اس راہ کے علاوہ ہر راہ کھوٹی ہے: **"ومن يبتغ غير الإسلام ديناً فلن يقبل منهُ"** (جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین پسند کرے گا اس دین کو ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا)، وہ انسان کی زندگی کا ایک مقصد متعین کرتا ہے، آج تک دنیا کا کوئی علم انسانی زندگی کا مقصد متعین نہ کرسکا، اس کا صاف اعلان ہے: **"وما خلقت الجن و الإنس إلا ليعبدون"** (میں نے جن وانس سب کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے)، اللہ کے عطا کیے ہوئے نظام زندگی کو جوں کا توں قبول کرنے، اپنی زندگی کو اسی کے مطابق ڈھالنے کا نام اس کے نزدیک ''عبادت'' ہے، اس کو وہ زندگی کا سیدھا راستہ قرار دیتا ہے: **"وأن اعبدوني هذا صراط مستقيم"** (بس میری عبادت کرو، یہی نہایت سیدھا راستہ ہے)، وہ انسانوں کی اکثریت کو تمام علوم وفنون کے باوجود ''لاعلم'' قرار دیتا ہے، اس کا کہنا ہے: **"ولكن أكثر الناس لا يعلمون –الآية"** (اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں، بس دنیا کی زندگی کی ظاہری پرت کو جانتے ہیں، آنے والی آخرت سے تو بالکل غافل ہیں)، یہ نہایت حقیقت پر مبنی اعلان ہے، جو انسان بہت کچھ جانے لیکن اسے یہ معلوم نہ ہو کہ خود اس کی اپنی زندگی کا کیا مقصد ہے، کیوں اسے اس قدر عقلی توانائیاں حاصل ہیں، کیوں اس کا مقام دنیا کی تمام مخلوقات سے اونچا رکھا گیا ہے، جب تک اس کا جواب وہ نہیں دیتا تب تک وہ لاعلم ہی قرار دیا جائے گا، اسی لیے اپنے اصلی مقصد سے غافل انسان کو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی پوری زندگی دو تین کاموں کے لیے وقف ہے؛ پیٹ بھرنا، نفسانی خواہشات کی تکمیل کرنا اور طاقت چلنے پر دوسروں کو دبا کر رکھنا، غور کیا جائے تو یہی کام جانور بھی کرتے ہیں، بلکہ بسا اوقات انسانوں سے بڑھ کر کرتے ہیں، اگر انسانوں کو بھی یہی سب کرنا تھا تو پھر اسے انسان ہی کیوں بنایا گیا، بے عقل جانور کیوں نہ بنایا گیا، انسان کا انسان بنایا جانا خود اس کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ رکھتا ہے کہ اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کا جواب قرآن یوں دیتا ہے: **"أفحسبتم أنما خلقناكم عبثا.....الآية"** (کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں بیکار پیدا کیا ہے اور کیا تمہیں ہمارے پاس دوبارہ لایا نہیں جائے گا)، وہ آسمان وزمین کے تعلق سے اپنا نقطۂ نظر یوں پیش کرتا ہے: **"وما خلقنا السماوات والأرض. الآية"** (ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کے درمیان موجود چیزوں کو کھیل تماشہ کے طور پر پیدا نہیں کیا، ہم نے ان کو ایک خالص مقصد کے لیے پیدا کیا ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں، بے شک تمام انسانوں کے لیے ایک دن متعین کردیا گیا ہے، جو فیصلہ کن دن ہوگا)۔

قرآن کریم قدرتی کاموں کے سامنے انسان کی عاجزی و درماندگی کو ذکر کرکے اسے غور وفکر کی دعوت دیتا ہے، کتنا عاجز ہے یہ انسان، آسمان سے پانی برسنا بند ہوجائے، انسان بھوکوں مرجائے: **"أفرأيتم الماء الذي تشربون. الآية"** (تمہارا اس پانی کے بارے میں کیا خیال ہے جو تم پیتے ہو، کیا بادلوں سے اسے اتارنے والے تم ہو کہ ہم ہیں)، زمین غلہ اگانا بند کردے تو کوئی کہاں سے کھائے، انسان ظاہری طور پر جس قدر محنت کرے لیکن غلہ اگانا اس کے بس کی بات نہیں: **"ما كان لكم أن تنبتوا شجرها. أإلهٌ مع الله"** (تمہارے بس کی بات نہیں کہ تم ایک درخت بھی اگاسکو)، خود انسان کی ذات کے اندر جو تصرفات ہو رہے ہیں، جس سے انسان کی پوری زندگی رواں دواں رہتی ہے، بے چارے انسان کو اس کی کیا خبر؟ **"وفي أنفسكم أفلا تبصرون"** (خود تمہاری ذات کے اندر اللہ کی نشانیاں ہیں، دیکھتے نہیں ہو!) ایک ہی غذا کھا کر ایک ہی طرح کی آب وہوا میں سانس لے کر ایک ہی طرح کے کام انجام دیتا ہوا انسان بچپن کی کمزوری سے جوانی کی طاقت کی طرف بڑھتا ہے، پھر ہمیشہ اسی غذا، اسی آب وہوا اور بالکل اسی طرح کی طرز زندگی کو اختیار کرنے کے باوجود وہ جوانی سے بڑھاپے کی کمزوری کی طرف آتا ہے، کون ہے جو اس کی ذات میں اس طرح کی تبدیلی کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ بسا اوقات وہ بچپن کی لاچاری کی طرف لوٹ آتا ہے، قرآن کہتا ہے: **"ومن نعمره ننكسه في الخلق أفلا يعقلون"** (جس کو ہم بہت عمر رسیدہ کرتے ہیں اسے اپنی ساخت کے لحاظ سے الٹ کر رکھ دیتے ہیں، (یعنی پہلے والی کیفیت آہستہ آہستہ آنی شروع ہوجاتی ہے) کیا یہ لوگ عقل سے کام نہیں لیتے) کہ کچھ سوچیں اور اپنی حقیقت پر غور کریں۔

جو انسان اپنی پیدائش، پرورش، رزق، طاقت، سانسوں کی آمد ورفت، جسمانی اندرونی نظام، کائنات کا آفاقی نظام، سردی گرمی، بارش، ہوا، پانی بلکہ زندگی کے ایک ایک لمحہ کے لیے ایک اللہ کا محتاج ہے وہ آخر عبادت، اطاعت، جذبات، احساسات اور اللہ کے مقرر کردہ قوانین میں اس کا محتاج کیوں نہ ہو؟! وہ آخر کس بل بوتے پر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ زندگی اسے اپنی مرضی کے مطابق گزارنی ہے، اپنے معبود اور خالق ومالک کی مرضی کے مطابق نہیں، اگر اپنی زندگی کا وہ خود خالق ومالک ہوتا تب یہ بات سمجھ میں آتی کہ انسان کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک اللہ کے سامنے سب کچھ نچھاور کیے بغیر کوئی زندگی کا مقصد پا نہیں سکتا، اور جو بے مقصد زندگی گزارتا ہے وہی سب سے بڑا نادان ہے۔

یہ قرآن کریم کا عطا کیا ہوا تصور انسان ہے، حقیقت یہ ہے کہ اسی دیے ہوئے تصور کے مطابق انسان اپنا کام اور اپنا مقصد سمجھ سکتا ہے اور اللہ کی بنائی ہوئی اس کائنات میں اپنی افادیت ثابت کرکے دونوں جہانوں کی سرخروئی حاصل کرسکتا ہے۔

الیکشن میں شرکت کا شرعی حکم

مفتی راشد حسین ندوی

پہلے زمانہ میں عام طور سے ملکوں کی تقسیم مذاہب اور نسلوں وغیرہ کے اعتبار سے ہوا کرتی تھی، ملک کسی خاص مذہب یا نسل سے تعلق رکھنے والوں کا ہوا کرتا تھا، وہ ملک کے پہلے درجہ کے شہری ہوا کرتے تھے، جبکہ دوسرے مذہب یا نسل کے لوگ دوسرے درجہ کے شہری ہوا کرتے تھے، عام طور سے ملک کے سیاسی حالات سے ان کو بہت ہی کم دلچسپی رہتی تھی، لیکن آج زمانہ بدل چکا ہے، دنیا ایک گاؤں بن گئی ہے، ملک میں مختلف مذاہب اور نسل کے لوگ رہتے ہیں اور کم سے کم قانونی اعتبار سے پہلے درجہ اور دوسرے درجہ کے شہری جیسی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی، یہ چیز یورپین ممالک میں تو تقریباً ہر جگہ ہی نظر آتی ہے، ہندوستان میں بھی کچھ فرق کے ساتھ یہی صورت حال ہے، اور فرق یہ ہے کہ یورپین ممالک میں دوسرے مذاہب والے بعد میں جا کر آباد ہوئے ہیں جبکہ ہندوستان جیسے ممالک میں مختلف قومیں صدیوں سے آباد ہیں۔

اس تناظر میں ہندوستان اور یورپین ممالک میں آباد مسلمانوں کو کئی سوالات کا سامنا ہے، انہیں مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ انتخابات میں شرکت کا بھی ہے، یہ سوال مسلمانوں کے لیے اس اعتبار سے بہت ہی اہم ہو جاتا ہے کہ دین اسلام بعض دوسرے مذاہب کی طرح صرف چند رسوم کے اختیار کر لینے کا نام نہیں ہے، اسلام میں زندگی کے تمام شعبوں کے لیے ہدایات دی گئی ہیں، اور کوئی شخص اسی وقت مؤمن کامل کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے جبکہ وہ ان تمام ہدایات اور اصولوں کے مطابق زندگی ڈھالے، جبکہ ہندوستان سمیت اس طرح کے تمام ممالک کی بنیاد سیکولرزم پر ہے، اسلام میں حاکم حقیقی اللہ تعالی ہے، ہر چیز میں اسی کا حکم نافذ کرنا ضروری ہے، جبکہ ان ممالک میں طاقت کا سرچشمہ جمہور ہیں اور پارلیمنٹ اکثریت کے بل بوتے پر کوئی بھی قانون پاس کر سکتی ہے، اس طرح اس نظام میں شرکت کرنا گویا ایک طرح سے اس نظام کو قبول کر لینا ہے جس کو ظاہر بات ہے کہ اسلامی شریعت کی رو سے جائز نہیں قرار دیا جا سکتا، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان اور اس طرح کے دوسرے ممالک میں مسلمانوں کے تین الگ طرح کے نقطۂ نظر پائے جاتے ہیں:

۱- ملک کے جمہوری اور سیکولر نظام کے تحت سیاسی معاملات میں دوسرے برادران وطن کی طرح کلی شرکت ۲- سیاسی عمل سے مکمل اجتناب ۳- کچھ تحفظات کے ساتھ شرکت۔

ان میں سے پہلا گروہ اکثریت میں ہے، پھر اس گروہ کی اکثریت دین و دنیا کی تفریق سے متعلق زہریلے پروپیگنڈے سے متاثر ہے، یہ اکثریت اپنے موقف کے لیے کسی شرعی دلیل کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتی، بلکہ عام طور سے ان کا ذہن بھی اس طرف نہیں جاتا۔

دوسرے گروہ کی دلیل یہ ہے کہ جمہوری اور پارلیمانی نظام میں قوانین وضع کرنے کا اختیار پارلیمنٹ کے پاس ہوتا ہے، جبکہ اسلام میں شارع حقیقی صرف اللہ تعالی ہے، غیر اللہ میں سے کسی کو بھی اس طرح کا اختیار تفویض کرنا شرک ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”ان الحکم الا للہ“ (سورۃ یوسف-۴۰) (حکومت نہیں ہے کسی کی سوائے اللہ کی)۔

اور تیسرا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ اس طرح کی صورت حال میں مسلمان اگر اپنا اصل میدان سیاست بنائیں گے تو وہ غیروں کی مد مقابل سمجھے جائیں گے اور اقلیت میں ہونے کے سبب بجائے فائدہ کے نقصان اٹھائیں گے، لہٰذا ان کو اپنا اصل میدان تو تعلیم، تجارت، صنعت اور فلاحی کاموں کو بنانا چاہیے، سیاست میں ان کا صرف اتنا حصہ ہونا چاہیے جتنا شرعاً ضرورت و حاجت کے دائرہ میں آتا ہو اور جو اصل میدان کے لیے معاون اور ناگزیر ہو۔

حکمت و مصلحت تقاضائے وقت اور تغیراتِ زمانہ پر غور کرنے کے بعد یہی گروہ اقرب الی الحق معلوم ہوتا ہے، اور اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

الف: اسلامی حکومت کا قیام فی الوقت ممکن نہیں۔

ب: دنیا کے حالات کچھ ایسے ہیں کہ مسلم ممالک کی طرف ہجرت بھی اجتماعی طور سے ناممکن ہے۔

ج: سیاست سے مکمل اجتناب اسلام دشمن لابی کو مضبوط کر دے گا اور اس صورت میں تبلیغی و تعلیمی مساعی کا جاری رکھنا بھی ناممکن ہوگا۔

د: حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر میں خزانوں کی نگرانی قبول کرنے کی پیشکش کی تھی اور قبول بھی کر لی تھی، جبکہ وہاں کی اصل حکومت مشرکین کے پاس تھی۔

لہٰذا انتخابی عمل میں شرکت کرنا جائز ہے، ووٹ دینا بھی اور نمائندہ بننا بھی، البتہ ووٹ دینا ایک طرح کی شہادت ہے کہ فلاں شخص میرے نزدیک نمائندگی کا سب سے زیادہ مستحق ہے، لہٰذا ووٹ دینے سے پہلے اچھی طرح جائزہ لے لیا جائے کہ ہم جس کو ووٹ دینے جا رہے ہیں اس کے اندر نمائندہ بننے کی قابلیت کے ساتھ ساتھ امانتداری کا وصف بھی پایا جا رہا ہو، وہ دوسروں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لیے زیادہ مفید ہو، اس معاملہ میں ضروری ہوگا کہ دوستی، قرابت داری علاقائیت نیز برادری اور ذاتی مفاد کو ترک کر دیا جائے، ورنہ وہ جھوٹی شہادت کا مرتکب ہوگا جس کو صحیح احادیث میں سب سے بڑا گناہ کہا گیا ہے اور اس کا شمار شرک کے ساتھ کیا گیا ہے۔

نمائندہ بننا ہو تو یہ شرط ہوگی کہ وہ ”حفیظ علیم“ ہو یعنی اپنے بارے میں پورا اعتماد ہو کہ اپنی ذمہ داری پر پوری قدرت رکھتا ہے، قوم کا بھرپور دفاع کر سکتا ہے اور امانت دار ہے۔

انتخابی مہم چلاتے وقت خیال رکھا جائے کہ کوئی بھی خلاف واقعہ بات نہ کی جائے، نہ بے جا الزامات لگائے جائیں نہ اپنی جھوٹی تعریف کی جائے، اس طرح کی شرائط کے ساتھ انتخابی مہم میں شرکت انشاء اللہ نہ صرف جائز بلکہ مستحسن اور بعض اوقات اس سے بھی بڑھ کر ہوگی۔ (واللہ اعلم)

ظلم کا انجام

محمود حسن حسنی ندوی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ایک روز جب کہ چند چیدہ علماء کی موجودگی میں علماء، صلحاء اور اولیاء کا ذکر ہو رہا تھا کہ کس طرح یہ لوگ زندگی بسر کرتے تھے، دنیا اور دنیا کی دولت ان کی نظر میں کتنی ہیچ و بے وقعت ہو جاتی تھی اور کس طرح یہ حضرات اکل حلال کا اہتمام اور حرام تو بہت دور کی چیز ہے مشتبہ مال سے بھی کس درجہ اجتناب کرتے تھے، فرمایا کہ:-''میں نے اس بات کا تتبع کیا ہے اور اولیاء، صلحاء کے حالات و واقعات کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ عموماً اولیاء، صلحاء، دینی فکری اور اہم خدمات انجام دینے والی شخصیتیں ان ہی خاندانوں میں پیدا ہوئی ہیں جن میں دو باتوں کا اہتمام رہا ہے، ۱- اکل حلال، ۲-ظلم سے اجتناب۔یعنی جو والدین اس کی پوری پوری رعایت کرتے ہیں کہ ان کے پیٹ کے اندر جو لقمہ پہنچے وہ حلال روزی کا ہو چاہے لقمۂ تر کے بجائے جو کی روٹی ہی پر کیوں نہ اکتفا کرنا پڑے، اور وہ اپنے کو اس سے بالکل محفوظ رکھتے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے کسی پر ادنیٰ سے ادنیٰ ظلم ہو اور ان کی ذات سے کسی کو تکلیف و اذیت پہنچے خواہ اس کا تعلق زبان سے ہو، یا ہاتھ سے''۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے جس اہم بات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ انسانی شخصیت سازی میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے، اگر انسان اس اصول کو اختیار کر لے کہ وہ جو اپنے لیے پسند کرتا ہے وہی اپنے دوسرے انسانی بھائی کے لیے پسند کرے گا، اور اپنا فائدہ حاصل کرتے وقت یہ سوچ لے کہ وہ فائدہ کس کام کا جو دوسرے کو نقصان پہنچا کر آئے؟! اور امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا گیا دل کس طریقہ سے نرم ہوتے ہیں، فرمایا اکل حلال سے۔

آج جبکہ خود غرضی، مفاد پرستی، حرص و ہوس کا دور دورہ ہے، اور مال و دولت کی بہتات کے شوق میں انسان دیوانگی کے حدود کو پار کر رہا ہے، اور جاہ طلبی میں اس سرعت سے کام لیتا نظر آ رہا ہے کہ وہ آگے بڑھے چاہے دوسرے کو دھکا دے کر ہی آگے بڑھے، برتری حاصل کرے چاہے دوسرے کا حق مار کر ہی یہ شوق پورا کرے، جبکہ اصل چیز خدمت اور قربانی ہے، قوموں، ملتوں، ملکوں اور حکومتوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ بلا قربانی اور بغیر خدمت خلق کے کسی کو عروج اور ترقی حاصل نہیں ہوتی، لیکن طاقت کا غرور اور اقتدار کا نشہ انسان کو ظلم و زیادتی، لوٹ کھسوٹ، اور حرص و ہوس پر ابھارتا ہے اور یہی چیز اس کے زوال کا سبب بنتی ہے، زوال فرد کو بھی آتا ہے جماعت کو بھی، قوموں کو بھی آتا ہے، حکومتوں کو بھی، اور پیام انسانیت کے ایک پروگرام میں دانشوروں کے بڑے مجمع کے سامنے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے بھی فرمایا کہ حکومتیں شرک و کفر کے ساتھ تو باقی رہ سکتی ہیں لیکن ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتیں۔ظلم انسان کی عزت و آبرو پر بھی ہوتا ہے اور اس کے مال و متاع پر بھی، یہی چیز ہے جو انسان سے اس شعور و احساس کو ختم کر دیتی ہے جو حلال و حرام، جائز و ناجائز کے احساس و خیال کا ہوتا ہے جبکہ اس سلسلہ میں حساسیت حد درجہ ہونی چاہیے۔کمالات اشرفیہ میں حضرت تھانویؒ کی یہ بات نقل کی گئی ہے کہ حرام طعام پر'' بسم اللہ'' کا کہنا کفر تک پہنچا دیتا ہے۔اسلام نے جن چیزوں کو نامناسب و غیر درست قرار دیا ہے اس میں اگر کسی ایک کو فائدہ پہنچتا دکھائی دیتا ہے تو دوسرے کو نقصان سے بھگتنا پڑتا ہے، سود کو ہی لے لیجئے، ایک مالدار ہوتا جاتا ہے، تو دوسرا غربت و افلاس میں ڈوبتا جاتا ہے، رشوت کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے، ایک کو فائدہ حاصل ہوتا جاتا ہے لیکن دوسرا اپنی اہلیت اور حقدار ہونے کے باوجود محروم ہو کر گھٹ گھٹ کر زندگی گزارتا ہے، وراثت کی ادائیگی میں طاقتور کمزور کو دبا لیتا ہے، لیکن پھر اس کی نسلیں اس کا خمیازہ بھگتتی ہیں، ظلم سے ہی مالِ حرام و ناجائز متاع آتا ہے، اور مال ہی ظلم و زیادتی کا بڑا سبب بنتا ہے، اس لیے یہ دو ایسے مرض ہیں جو دھیرے دھیرے معاشرے کو تباہ کر دیتے ہیں اور انسانی سماج کو ہلاکت کے دہانے پر کھڑا کر دیتے ہیں۔

ظلم چھوٹا بھی ہوتا ہے اور بڑا بھی اور چھوٹے سے چھوٹا بھی، ایک چھوٹی سی مسواک کا جھوٹا دعویدار بن جانا بھی دوسرے پر ظلم ہے کہ دوسرے کی چیز پر قبضہ جمایا اور پھر اس کو جھٹلایا بھی، اسی طرح ایک بالشت بھر ہی سہی کسی کی زمین دبالی تو آخرت میں اسے سات زمینوں کے طوق کا بار اٹھانا پڑے گا، اسی طرح تہمت لگانا، الزام لگانا، یہ عزت و آبرو پر ظلم ہے، اور مسلمان کی آبروریزی کو حدیث میں تو بدترین سود کہا گیا ہے، غیر مسلم سے بھی بلا وجہ الجھنا اور اس کو ستانا یہ بھی ظلم ہے، اور جان لینا تو پوری انسانیت پر ظلم ہے، اسی لیے قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے: ''**من قتل نفساً بغير نفس أو فساد في الأرض فكأنما قتل الناس جميعاً، ومن أحياها فكأنما أحيا الناس جميعاً**'' ،اور کسی مؤمن مسلم کو ناحق مار ڈالنے کے بارے میں سخت ترین وعید سنائی، آیت ربانی ہے:''**ومن يقتل مؤمناً متعمداً فجزاء ۂ جهنم خالداً فيها و غضب الله عليه ولعنه و أعدلهٗ عذاباً عظيماً**'' غور کیجیے تو ایسے شخص کو یہاں پانچ عذابوں سے ڈرایا گیا ہے، کسی کی جان لینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو تمام تر خواہشوں سے محروم کیا، مال و متاع، عزت و آبرو پر ڈاکہ ڈالا، اور اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے دوسرے کی ساری خواہشات کا قلع قمع کیا اور اس کے متعلقین کے جذبات و احساسات کا بھی خون کیا۔

ظلم کیسا ہی کیوں نہ ہو اس کے عواقب سنگین ہوتے ہیں، اور ظالم کی نسلیں خمیازہ بھگتتی ہیں، پشتہا پشت پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں، اسی لیے ظلم والے کاموں اور ظالم لوگوں کی طرف معمولی جھکاؤ اور ذرا بھی نرم گوشہ رکھنا اللہ کی رحمت سے دوری کا سبب بن جاتا ہے، درآنحالیکہ شرک کو ظلم عظیم کہا گیا ہے تو ایسے اعمال سے دوری بنائے رکھنا جس میں شرک کی ہلکی سی بو بھی آ رہی ہو تقرب الٰہی کے لیے ضروری ہے، ورنہ نیکیوں سے معمور زندگی بھی کچھ کام نہ دے سکے گی، اسی لیے صاف طور پر کہہ دیا گیا ہے:''**ولا تركنوآ إلىٰ الذين ظلموا فتمسكم النار ، وما لكم من دون الله من أوليآء ثم لا تنصرون**'' چنانچہ اللہ نے جس کا جو حق رکھا ہے اس کی اسی طرح ادائیگی ضروری ہے، اور سب سے بڑھ کر اللہ کا حق ہے، اور اس کے حقوق میں ایمان باللہ کے بعد اقامت صلوٰۃ سب سے مقدم حق ہے، اس کے بعد والی آیت میں اقامت صلوٰۃ کا حکم دے کر سرخروئی کا راستہ بتا دیا ہے، ارشاد ربانی ہے:''**وأقم الصلوٰة طرفي النهار و زلفاً من الليل، إن الحسنات يذهبن السيئات، ذٰلك ذكرىٰ للذاكرين**'' ،اسی طرح اقامت صلوٰۃ (نماز) میں ایک طرف اللہ کے حقوق کی ادائیگی ہے تو دوسری طرف بندوں کے حقوق میں کوتاہی کی تلافی کا سامان ہے اور ان کے حقوق کی ادائیگی کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔

یوم خواتین

جعفر مسعود حسنی ندوی

ہر سال ۸ مارچ کو پوری دنیا میں یوم خواتین منایا جاتا ہے، اس روز خواتین سے متعلق سیمینار منعقد ہوتے ہیں، ریڈیو اور ٹیلیویژن سے خصوصی پروگرام نشر ہوتے ہیں، اخبارات ورسائل میں خصوصی مضامین شائع ہوتے ہیں گویا اس دن خواتین کے سلسلہ میں ایک شور مچتا ہے، ایک ہنگامہ بپا ہوتا ہے، تجاویز پاس ہوتی ہیں، خواتین کے حقوق کے لیے صدائیں بلند ہوتی ہیں اور عورت کو صرف عورت کے روپ میں دیکھ کر وہ فیصلے کیے جاتے ہیں جن میں نہ بیٹی کی معصومیت کا لحاظ ہوتا ہے اور نہ ماں کی عظمت کا پاس، اس دن صرف عورت ہوتی ہے اور عورت کی ترقی کی راہ میں حائل اسلام۔

ہر سال کی طرح گزشتہ ماہ کی ۸ تاریخ کو بھی خواتین کے ہمدردوں نے یوم خواتین منا کر خواتین کے تئیں اپنی ہمدردی اور فکرمندی کا اظہار کیا، اس روز بھی وہی سب کچھ ہوا جو ہر سال ہوتا چلا آیا ہے، عورت موضوع بنی اور اسلام نشانہ، کمانوں سے تیر برسے، توپوں نے گولے اگلے، اور دلوں کی عداوت باہر آئی، اور جب دن ڈھلا اور خواتین کے سلسلہ کا یہ پروگرام اپنے اختتام کو پہنچا تو ڈنمارک کی ایک خاتون نے دنیا کے تمام خواتین کی نمائندگی کرتے ہوئے اسٹیج پر آکر پروگرام کا آخری آئیٹم پیش کیا، پوری دنیا کی نظریں اس پروگرام پر لگی ہوئی تھیں، پریس رپورٹرس اس کی منظر کشی کے لیے قلم تھامے بیٹھے تھے، فوٹو گرافرس اس کی فلم بندی کے لیے پوری طرح مستعد تھے، اور مغربی دنیا کے تمام بڑے چینل اس کو نشر کرنے کے لیے بے قرار تھے، بالآخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور مہذب دنیا کی ایک خاتون ایک برقع کے ساتھ اسٹیج پر نمودار ہوئیں اور اس برقعہ کو آگ لگا کر اسلامی تہذیب پر مغربی تہذیب کی فتحیابی کا اعلان کیا، تالیاں بجیں، نعرے لگے، جام چلے، جسم لڑھکے، اور یوم خواتین دھیرے دھیرے جشن فتح میں تبدیل ہوتا گیا۔

خواتین کے نام کا بینر لگا کر اسلام کے خلاف زہر اگلنے کا یہ سلسلہ برسوں سے جاری ہے، اس دن تذکرہ نہ عیسائیت کا ہوتا ہے نہ عیسائیت میں عورت کے مقام کا، نہ ذکر یہودیت کا ہوتا ہے نہ یہودیت میں عورت کے مرتبہ کا، نہ بات بودھ مذہب کی چھڑتی ہے نہ بودھ مذہب میں عورت کے حقوق کی، نہ ہندو مذہب پر کوئی گفتگو ہوتی ہے نہ ہندو مذہب میں عورت کی حیثیت کی، نہ اس تہذیب جدید کے خلاف لب کشائی کا موقع کسی کو دیا جاتا ہے اور نہ تہذیب جدید میں عورت کے ساتھ سلوک پر تبصرے کی کسی کو اجازت ملتی ہے۔

۱۹۷۵ء سے ۲۰۰۸ء تک حقوق نسواں سے متعلق دنیا کے مختلف ملکوں میں ۸ سے زیادہ عالمی کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں اور ان تمام کانفرنسوں میں سب سے زیادہ زور صرف چار باتوں پر دیا گیا ہے: (۱) عورت کو اپنے جسم کے استعمال کی پوری آزادی ملنی چاہیے (۲) جنسی تعلق کے سلسلہ میں عورت پر کسی بھی طرح کی پابندی نہیں لگنی چاہیے (۳) اسلامی وراثت کے نظام کے خلاف آواز اٹھانا چاہیے کیونکہ وراثت کا یہ نظام عورت اور مرد کے درمیان تفریق کی بنیادی وجہ ہے (۴) والدین کی بالادستی ختم کر کے عورت کو اپنے مرضی سے زندگی گزارنے کا موقع دینا چاہیے۔

مشرقی ممالک کو چھوڑیے ابھی وہ نہ تو عورت کو پوری آزادی دے سکے اور نہ عورت کو والدین کے دباؤ، خاندانی رکاوٹوں اور معاشرہ کی پاکیزہ قدروں سے پوری طرح چھٹکارا دلا سکے۔ مغربی دنیا کے ان ترقی یافتہ ممالک کو دیکھیے جو عورت کو تنہا جینے اور اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے تیار کر چکے ہیں، دیکھیے وہاں عورت نے کتنی ترقی کی؟ آزادی سے اس کو کیا فوائد حاصل ہوئے؟ خاندان سے جدا ہونے کے کیا نتائج اس کے سامنے آئے؟ پردہ سے ناطہ توڑ کر اس کو کیا کامیابی ملی؟ والدین سے بغاوت کر کے اس کو کتنا سکون واطمنان نصیب ہوا؟ آیئے! عورت کی آزادی کے پرزور وکیلوں کے بیانات کی روشنی میں دیکھتے ہیں کہ مغرب نے آزادی کے نام پر عورت کو کیا دیا:

اسپین کے ایک پروفیسر ''سیمونس مور'' (Simmons Moore) بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہوئے: ''یورپ میں کیے گئے تازہ ترین سروے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ مغربی ممالک میں عورت سب سے بدتر حالت میں زندگی گزار رہی ہے، نہ اس کا کوئی سہارا ہے اور نہ مستقل اس کا کوئی ٹھکانہ، وہ ایک بے سہارا عورت ہے جس کا نہ میکہ ہے نہ سسرال، نہ بچے ہیں اور نہ شوہر''۔

فرانس میں خواتین کی ایک مشہور تنظیم کی چیرپرسن ''میشیل اندریہ'' (Michelle Andrea) فرانس میں خواتین کی حالت زار پر اپنے غصہ کا اظہار مشرقی انداز میں اس طرح کرتی ہیں: ''ارے یہاں! یہاں عورت کی حالت جانوروں سے بھی بدتر ہے، جانوروں کے ساتھ تو اچھے معاملے کی توقع کی جاسکتی ہے، لیکن عورت کے ساتھ اچھے معاملے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اگر کسی شخص نے سڑک پر کسی کتے کو مار دیا تو کوئی نہ کوئی راہ گیر اس شخص کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا دیتا ہے، لیکن سڑک پر شوہر کے ہاتھوں بیوی کو پٹتا دیکھ کر کسی کے دل میں کوئی ہمدردی نہیں پیدا ہوتی، عدالت جانا تو دور کی بات ہے، دو قدم بڑھ کر اس عورت کی مدد کرنے کا بھی کوئی روادار نہیں ہوتا''۔

''کورفیل یونیورسٹی'' امریکہ (Korfel University, America) کے سروے کے مطابق امریکہ میں ملازمت پیشہ خواتین میں ۷۰٪ خواتین کی جانب سے بدسلوکی اور جسمانی استحصال کی شکایتیں موصول ہوتی ہیں۔

کینڈا میں ''منسٹری آف وومن افیرس'' (Ministry of Women Affairs) نے خادماؤں سے متعلق جو رپورٹ پیش کی ہے اس میں صراحت سے یہ بات کہی گئی ہے کہ کینڈا میں چالیس فیصد خادماؤں کو مار پیٹ، ایذا رسانی اور توہین آمیز سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

یہ ہے وہ آزادی، ترقی اور سکون جو عورت نے مغربی دنیا میں مغربی تہذیب اپنا کر حاصل کیا! افسوس کہ عورت کو ترقی کی راہ پر ڈالنے کی یہ کوششیں اب اسلامی دنیا میں بھی شروع ہو چکی ہیں اور پردہ اور خواتین سے متعلق اسلامی ہدایات کے خلاف آواز اٹھائی جانے لگی ہے، کیونکہ پردہ اور قرآنی احکامات عورت کی عزت و ناموس کی حفاظت کا سب سے بڑا ذریعہ اور اس کی ترقی اور عظمت کا سب سے بڑا ضامن ہے، تب ہی تو دو سو سال قبل ایک برطانوی وزیر اعظم نے کہا تھا ''مشرقی دنیا اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ دو کام نہ کرے: (۱) عورت کا پردہ اتارے (۲) (خاکم بدہن) قرآن (کریم) پر وہ پردہ ڈال دے۔ آدھا کام تو ہم نے کر دیا اور آدھا کام ابھی باقی ہے''!!

ملک کا سیاسی منظر نامہ
اور مسلم ووٹ

محمد نفیس خاں ندوی

لوک سبھا انتخابات کا آغاز ہو چکا ہے، ساری پارٹیاں اپنے اپنے مہرے بچھا چکی ہیں، عوام کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور زیادہ سے زیادہ ووٹ بٹورنے کی دھن میں پارٹیوں نے وعدوں اور وعیدوں کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے، اس رو میں بہک کر بعض لیڈروں نے قابل اعتراض بیانات بھی دیے جو دراصل ان کی سوچ اور ذہن و دماغ میں پنپ رہی فرقہ پرستی کا غبار ہے، البتہ الیکشن کمیشن نے اپنی بیدار مغزی کا ثبوت دے کر حالات کو بے قابو ہونے نہیں دیا، الیکشن کی اس ساری گہما گہمی کا مرکزی موضوع ''مسلم ووٹ'' ہے، ہر پارٹی کی سب سے زیادہ توجہ مسلمانوں کو اپنی جانب راغب کرنے کی ہے، جس کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ مسلم ووٹ میں اتنی طاقت ہے کہ واقعہ کا رخ بھی پلٹ سکتا ہے۔

گذشتہ ساٹھ سالوں سے مختلف پارٹیوں نے مسلم ووٹ کے سہارے ہی حکومت کی ہے یا بالفاظ دیگر ان کا سیاسی استحصال کیا ہے، سیکولرزم کا دم بھرنے والی پارٹیوں نے ''ہندوتو'' اور فرقہ پرست پارٹیوں کی اشتعال انگیزی کا ہوا کھڑا کر کے اپنے سیاسی مفادات کی تکمیل کی، مسلمان کبھی ذیلی وعلاقائی تو کبھی ملکی پارٹیوں کے فریب میں الجھے رہے، اور ان پارٹیوں نے مسلمانوں کو محض اپنا ''ووٹ بینک'' سمجھا، ہر الیکشن کے موقع پر یہ پارٹیاں اپنے انتخابی منشور میں مسلمانوں سے وعدے تو کرتی ہیں لیکن وقت آنے پر انھیں تسلیاں دے کر بہلا بھی دیتی ہیں، اس طرح مسلمانوں کے اپنے مسائل، خاص کر ان کے عائلی مسائل حل ہونے کے بجائے بڑھتے ہی چلے گئے، اور آزادی کے بعد سے وہ سیاسی، سماجی، تعلیمی، معاشی، ہر طرح کے مسائل سے دوچار ہیں، جس کی سنگینی کا اندازہ ''سچر کمیٹی رپورٹ'' سے بخوبی کیا جاسکتا ہے، مسلمانوں سے ہمدردی کے اظہار میں یہ کمیٹی تشکیل دی گئی تھی لیکن افسوس کہ رپورٹ کے آنے تک یہ جذبہ سرد پڑ گیا، اور اب صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کی ساری صلاحیتیں خود کو اس ملک کا وفادار شہری ثابت کرنے میں ضائع ہو رہی ہیں اور ان کی عبادت گاہوں، ان کی وقف جائدادوں، اور ان کے نوجوانوں کے مستقبل پر ایک سوالیہ نشان ہے جو ہر ذی شعور اور غیور مسلمان کو نہ صرف ایک فیصلہ کن اقدام کی، بلکہ سیاسی طور پر اپنا لائحۂ عمل طے کرنے اور اپنی بے وزنی کے اسباب تلاش کرنے کی بھی دعوت دے رہا ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مسلمان سیاسی جھمیلوں سے دور نہیں رہ سکتے، اور خاص کر اس ملک میں جہاں سروں کو گنا جاتا ہے مسلمانوں کا سیاست سے بالکل الگ ہونا یا کسی مخصوص پارٹی سے اٹوٹ وابستگی رکھنا دونوں ان کے حق میں نقصاندہ ہوسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی استحکام اور ان کے مسائل کو لے کر متعدد اہم آراء سامنے آئیں جن میں بنیادی طور پر اس بات پر زور رہا ہے کہ مسلمانوں کی اپنی سیاسی پارٹی ناگزیر ہے، البتہ اس سلسلہ میں مسلم لیڈروں کے درمیان آراء کا زبردست اختلاف سامنے آیا، ایک جماعت کا کہنا ہے کہ علیٰحدہ سیاسی جماعت کی ضرورت نہیں، مسلمانوں کو ملک میں موجود مختلف سیکولر پارٹیوں کا ساتھ دینا چاہیے، انھیں اس بات کا بھی خدشہ ہے کہ اگر مسلمان سیاسی طور پر متحد ہو گئے تو غیر مسلم بھی یکتائی میں آجائیں گے، لیکن دوسری جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ مسلم سیاسی پارٹی لازمی ہے، اب تک سیکولر پارٹیوں نے سیکولرزم کے نام پر صرف مسلمانوں کا استحصال کیا ہے۔ اور پھر یہ آواز اس زور سے اٹھائی گئی کہ ایک نہیں متعدد مسلم پارٹیاں وجود میں آگئیں۔ مسلم پارٹی کا وجود ایک قابل ستائش اقدام تھا کہ مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جوڑنے کی یہ کوشش ہے، مسلم اکثریت والے صوبوں میں تو یہ تجربہ کارگر ہوسکتا ہے لیکن پورے ملک میں اسی تجربہ کو دہرانا سیاسی مصلحت کے خلاف سمجھا جاسکتا ہے، اسی کا اثر ہے کہ کئی آل انڈیا مسلم پارٹیاں وجود میں ضرور آئیں لیکن افسوس کہ کہیں ان پارٹیوں کو اپنا مضبوط امیدوار نہ مل سکا تو کہیں ان کو سہارا غیر مسلم کا ہی لینا پڑا، یا بالفاظ دیگر مسلمانوں نے ایک پلیٹ فارم بنا کر دوسروں کے حوالہ کر دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب بات مسلمانوں کی سیاسی طاقت کو مجتمع کرنے کی آتی ہے تو ہر پارٹی اور ہر شخصیت چاہتی ہے کہ قیادت کی ذمہ داری اسی کو دی جائے اور باقی سب اس کے پیچھے چلیں نتیجتاً انتشار اور بڑھتا جاتا ہے۔

ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے اور یہ یہاں کے ہر طبقہ اور فرقہ کے لیے مفید ہے خاص کر مسلمانوں کا مستقبل اسی میں محفوظ ہے، اس لیے مسلمان ہمیشہ سے یہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ یہاں سیکولر سیاست کو تقویت فراہم کی جائے، اگر یہاں سے سیکولرزم کو ختم کیا گیا تو یقیناً اس ملک کا جغرافیہ بدل جائے گا اور اس کے ذمہ دار مسلمان بھی ہوں گے!!۔

لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ مسلمان ووٹ دیں تو کس پارٹی کو؟ اب تک کے تجربے بتا رہے ہیں کہ یہ ساری پارٹیاں مسلمانوں کے تئیں غیر سنجیدہ ہیں بلکہ الکفر ملة واحدة کی عملی تفسیر ہیں، تو سب سے پہلے یہ سمجھنا ہوگا کہ سیاست محض کسی نظریہ یا کسی فکر کا نام نہیں بلکہ یہ وہ زمینی حقائق ہیں جن سے مسلمان اب تک دور رہے ہیں، اور اگر سیاست کو سیاسی نظر سے دیکھا جائے تو خاص کر اس ملک میں مسلمانوں کی اپنی سیاسی پارٹی اس وقت تک بے سود ہے جب تک مسلمان تعلیمی و معاشی اعتبار سے مضبوط نہیں ہو جاتے، اس وقت ضرورت ہندستان کی سیکولر فضا کا فائدہ اٹھانے کی ہے، غیر مسلموں کے اندر تک گھسنے اور حالات کو اپنے موافق بنانے کی ہے۔ اس حقیقت سے یہودی اچھی طرح واقف ہیں، اور آج ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ دنیا پر ان کا اقتدار ہے لیکن ان کی کوئی سیاسی پارٹی نہیں، امریکہ میں صرف دو پارٹی نظام ہے، حکومت چاہے جس پارٹی کی ہو یہودیوں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہندستان جیسے جمہوری اور سیکولر ملک میں یہ کام نسبتاً اور بھی آسان ہے، اس ملک کی بڑی پارٹیوں میں رسوخ حاصل کرنا کچھ مشکل نہیں ہے، حکومت چاہے جس پارٹی کی بنے اگر مسلمان اس میں مؤثر ڈھنگ سے شریک ہیں تو مسلمانوں کے بہت سے مسائل خود حل ہو سکتے ہیں، اسی طرح ذیلی وعلاقائی پارٹیاں بھی قابو سے باہر نہیں ہیں، ان کو مضبوط کرنے اور ان کے ساتھ خود کو مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کوشش یہ ہونی چاہیے کہ مسلمان ہر پارٹی سے جڑیں اور ایسے امیدوار کو ووٹ دیں جس میں دوسروں کے مقابل زیادہ انسانیت پائی جاتی ہو، اور مسلمان بھاری اکثریت میں پولنگ بوتھ پہنچ کر اپنے حق رائے دہی کا استعمال کریں، اس ملک میں یہی ایک طریقہ ہے مسلمانوں کے استحکام اور ان کے مستقبل کی حفاظت کا!!